الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

بدخواہی ایک ایسا زہر ہے ——
جس کا نصف حصہ آدمی کو خود پینا پڑتا ہے

اپریل ۱۹۸۳ ☐ قیمت فی پرچہ — تین روپے ☐ شمارہ ۷۷

خدا اور انسان

مولانا وحیدالدّین خاں

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

سالِ اشاعت ۱۹۸۳ قیمت تین روپئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کر لیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہئے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہئے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدائے لم یزل کا پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لئے اس نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لئے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کر لیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال و حرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

وحید الدین ۱۴ مارچ ۱۹۸۲

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گردوپیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لئے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پاکر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارہ میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں

تمام سفروں میں ٹرین کا سفر سب سے زیادہ تجربات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ انسانی قافلوں کو لئے ہوئے تیز رفتار اکسپرس دوڑی چلی جارہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف قدرت کے مناظر مسلسل ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طرح ٹرین گویا زندگی کے بڑے سفر کی ایک علامت بن گئی ہے جو نشانیوں سے بھری ہوئی ایک دنیا میں انسان طے کر رہا ہے۔ مگر جس طرح ٹرین کے مسافر اطراف کے مناظر سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرے۔

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے غروب ہو جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کی رعنائیاں سب ایک عظیم "اجتماع" کے شرکار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔ ایک سفر میں ہم ایک درمیانی اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لئے اترے۔ اسٹیشن کے آدمیوں سے پوچھا کہ "پچھم کس طرف ہے"۔ مگر کسی کے پاس اس سادہ سے سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا "سورج ایک روشن ترین حقیقت کی حیثیت سے روزانہ ان کے اوپر نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ مگر لوگ اپنے آپ میں اتنا گم ہیں کہ ان کو مشرق و مغرب کا پتہ نہیں۔ پھر وہ لطیف پیغام جو سورج اور اس کے کائناتی ساتھی اپنی خاموش زبان میں نشر کر رہے ہیں ان سے کیسے کوئی باخبر ہو سکتا ہے۔

ہماری ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آکر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ہرے بھرے درخت، ان کے پیچھے سرخی ملی ہوئی روشنی اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے بادل، عجیب آفاقی حسن کا منظر پیدا کر رہے تھے۔ "ان میں یہ حسن ان کی بلندی نے پیدا کیا ہے"، میں نے سوچا۔ "مگر انسان اس بلندی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس سطح پر نہیں جیتا جس سطح پر درخت جی رہے ہیں۔ وہ وہاں بسیرا نہیں لیتا جہاں روشنی اور بادل بسیرا لئے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سطحی مفادات میں جیتا ہے۔ وہ جھوٹی دوستی اور جھوٹی دشمنی میں سانس لیتا ہے۔ کائنات کا ہم سفر بننے کے بجائے اپنے آپ کو وہ اپنی ذات کے خول میں بند کر لیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں جنتی فضائیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہاں وہ اپنے آپ کو دوزخ کے ماحول میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دنیا کے بگاڑ کی ساری وجہ یہی ہے۔ اگر وہ بلند سطح پر جینے لگے تو اس کی زندگی میں بھی نیا حسن آجائے جو قدرت کے حسین مناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ (۱۶ مارچ ۱۹۷۹)

خدا کی دنیا

جب آپ اپنے کمرہ میں ہوں تو آپ اس کی چھت کو ناپ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کی لمبائی کتنی ہے اور چوڑائی کتنی۔ مگر جب آپ کھلے میدان میں آسمان کے نیچے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپنے کے لئے آپ کے تمام پیمانے ناکافی ہیں۔ یہی حال خدا کی پوری کائنات کا ہے۔ ایک بیج جس طرح بڑھ کر درخت کی ایک دنیا بناتا ہے اس کو کون بیان کر سکتا ہے۔ سورج کی روشنی، ہواؤں کا نظام، چڑیوں کے نغمے، پانی کے بہتے ہوئے چشمے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سچائی اس سے زیادہ لطیف ہے کہ اس کو انسانی لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے وہاں سے حقائق شروع ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ ساتھ نہیں دیتے وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ خدا چپ کی زبان میں بول رہا ہے اور ہم اس کو شور کی زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی آوازوں کو سن سکیں۔ اس دنیا کی سب سے قیمتی باتیں وہ ہیں جو چپ کے بول میں نشر ہو رہی ہیں مگر جو لوگ صرف شور وغل کی بولیاں سننا جانتے ہوں وہ ان قیمتی باتوں سے اسی طرح ناآشنا رہتے ہیں جس طرح ایک بہرا شخص کسی عمدہ موسیقی سے۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی جب اس دنیا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خدا کی اس ابدی دنیا کا باشندہ بن جائے ——— وہ ہواؤں میں شامل ہو جائے وہ درختوں کی سرسبزیوں میں جا بسے۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ مگر انسان کی محدودیتیں اس کی اس خواہش کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنی محبوب دنیا کو دیکھتا ہے مگر اس میں شامل نہیں ہو پاتا۔ شاید جنت اسی کا نام ہے کہ آدمی کو اس کی محدودیتوں سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ خدا کی حسین دنیا میں ابدی طور پر داخل ہو جائے۔

انسان نے جو تمدنی دنیا بنائی ہے وہ خدا کی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی سواریاں شور اور دھواں پیدا کرتی ہیں مگر خدا کی دنیا میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور نہ کہیں شور ہوتا ہے اور نہ دھواں۔ انسان انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، مگر خدا کی دنیا میں ہوا اس طرح گزرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ انسان اپنی غلاظت کو کاربن اور پسینہ اور بول وبراز کی صورت میں خارج کرتا ہے مگر خدا نے اپنی دنیا میں جو درخت اگائے ہیں وہ اس کے برعکس اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوشبو کی صورت میں۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام شہروں میں کوڑے کو ٹھکانے لگانا ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر خدا کی بنائی ہوئی وسیع تر دنیا میں ہر روز بڑے پیمانہ پر "کوڑا" نکلتا ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس کو Recycle کر کے دوبارہ کائنات کے مفید اجزاء میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ——— جو شخص حقیقت کی جھلک دیکھ لے وہ اس کے بیان سے اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر چپ طاری ہو جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظوں کا سیلاب بہانے لگے۔

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف اگست ۱۹۶۲ میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو ۲۱ اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا:

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لئے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لئے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لئے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لئے نثار کر دے۔

روسی خلا باز پر جو کیفیت زمین کو پاکر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہئے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لئے۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں۔ کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی۔ فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا۔ ایڈلر نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا۔ میک ڈوگل نے غلط طور پر کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے۔ مارکس نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے، مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پا لیا ہے۔ اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے زور اور مفلس آدمی۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لئے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو۔ مگر جب وہ اس کو پا لیتا ہے اور قریب سے اس کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔

سب کچھ عجیب ہے

۱۹۵۷ میں روس نے پہلا اسپٹنک خلا میں بھیجا تھا۔ امریکہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لئے استعمال ہوسکتی ہے۔

کولمبیا کا وزن ۷۵ ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ۲۶ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ ۵۴ گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد ۳۶ چکر لگا کر ۱۰ لاکھ میل طے کئے اور پھر ۱۴ اپریل کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈ اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر ۳۴۵ کیلومیٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوائی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہوگئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت ۱۵۰۰ درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل ۳۱ ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف ۱۰ سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں ۲۰ ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کرسکیں۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر ینگ (John Young) تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے۔ ۵۴ گھنٹہ بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ——— کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا:

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو ایسا حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے: میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا ہی عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی اسی عجوبہ کو دیکھ لے۔

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اور اس سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اور حرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اور اس سے بہت زیادہ روشن بھی۔ روشنی اور حرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (Hans Bethe) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر ۱۹۶۷ میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (پیدائش ۱۹۰۶) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لئے جوش و مسرت کا ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا: کیا تم کو خبر ہے کہ اِس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں۔

Do you realize, just now you are standing next to
the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔ اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔ اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ ایمان باللہ ایک دریافت (Discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفور جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز — خدا کو دریافت کرتے ہیں اور ان کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔ شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو ۱۵ میں امریکہ کے جو تین خلا باز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز اروِن (James Irwin) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست ۱۹۷۲ کا وہ لمحہ میرے لئے بڑا عجیب تھا جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's Presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لئے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲)

کرنل جیمز اروِن کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد و پیش جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب حد درجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر ایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا اور پہلی بار وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامہ میں اس کے خالق کو موجود پایا۔ ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں یہاں بھی "خدا کی موجودگی" کا تجربہ اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح چاند پر پہنچ کر کرنل اروِن کو ہوا۔ مگر لوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی دنیا کو اس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس "خدا کی موجودگی" کا تجربہ ہو۔ ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک اعلیٰ درجہ کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینئر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کو اور اس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔ خالق ہم کو اس طرح نظر آئے گا کہ ہم خالق اور تخلیق کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرے۔ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمسِ ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہو جائے۔

کائنات کا دسترخوان

قرآن میں ہے کہ اللہ آسمان وزمین کا نور ہے (نور) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا تمام کی تمام خدائی صفات کا مظہر ہے۔ حساس قلب کو یہاں کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ رزق خداوندی کا دسترخوان ہے۔

خدا پر ایمان اگر کسی آدمی کو وہ حساسیت دیدے جو خدا پر سچے ایمان سے پیدا ہوتی ہے تو کائنات میں فی الواقع اس کو ہر طرف خدا کا نور دکھائی دے گا۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوئیں گے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اسے مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمتِ حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آئے گا۔ چڑیوں کے چہچہے جب اس کے کان میں رس گھولیں گے تو اس کے دل کے تاروں پر زمزمۂ خداوندی کے نغمے جاگ اٹھیں گے۔ پھولوں کی مہک جب اس کے مشامِ جان کو معطر کرے گی تو وہ اس کے لئے خدائی خوشبو میں نہانے کے ہم معنی بن جائے گی۔

ساری کائنات مومن کے لئے رزق روحانی کا دسترخوان ہے، ویسے ہی جیسے جنت اس کے لئے رزق مادی کا دسترخوان ہوگی۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پالے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لئے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لئے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے ——— "خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لئے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کر دئے ہوں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہو سکتا، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لئے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے —— قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنی بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (Charless Richter) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رشٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رشٹر نے کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہئے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لئے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس ۷ اکتوبر ۸۰)

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ہر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوتے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ظاہر فریبی

ایر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۱ کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ ۲۵ آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھ گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۱)

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑانیں بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لئے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرلے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے، یہاں کی ہر بڑائی کو چھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم کو پیاس لگتی ہے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے سچائی کی تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہئے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مر جاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لا محدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لا محدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لا محدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی، محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کر سکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لئے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہو کر اپنے بارے میں ہمیں بتا دے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لئے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنا لے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ آزادی پا کر سرکش بن جائیں ان کے لئے جہنم۔

اندھیرا ختم ہو گا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔

جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کر کے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا، وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے الم ناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے درندگی کے واقعات آتے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارہ میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ مگر یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ خالق کی اسکیم میں دنیا دارالامتحان ہے مگر ہم اس کو دارالجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو۔ ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں۔ سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہو گا، مگر وہ موت کے بعد ہو گا نہ کہ موت سے پہلے۔

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو۔ یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب سے بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مر جاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کر سکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کر کے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا لیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پا لیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہو کر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتا رہا ہو۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹنے والی سورج کی ابتدائی شعاعیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بے حد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کامل زندگی ہوتے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

تضاد ختم ہوگا

میں آبادی سے دور ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا تھا۔ سرسبز درخت میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی بولیاں کانوں میں آرہی تھیں۔ مختلف قسم کے جانور چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوپر عجیب تاثر ہوا۔ کیسا عظیم اور کیسا کامل ہوگا وہ خدا جس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور پھر اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے نقشہ کی انتہائی پابند رہتے ہوئے حرکت کرے۔

کتنی حسین اور کتنی معصوم ہے یہ دنیا۔ یہاں چڑیاں وہی آوازیں نکالتی ہیں جو ان کے خالق نے انھیں سکھایا ہے۔ یہاں بلّی اور بکری بالکل اسی طرح اپنا اپنا رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہاں درخت عین اسی منصوبہ کے مطابق اگتے اور بڑھتے ہیں جو ازل سے ان کے مالک نے ان کے لئے متعین کر دیا ہے۔ یہاں دریا ٹھیک اسی قانون کے مطابق رواں ہوتا ہے جو اس کے لئے ابدی طور پر مقدر ہے۔ خدا کی کائنات انتہائی کامل مجموعہ ہے اور یہاں کی ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر عین اسی طرح عمل کرتی ہے جس کا حکم اس کے خدا نے اسے دے رکھا ہے۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے منھ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جس کی اجازت اس کے خدا نے اسے نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو اپنا رزق بناتا ہے جس سے اس کے مالک نے اس کو روک رکھا ہے۔ وہ اپنے سفر حیات کے لئے ایسے راستے اختیار کرتا ہے جہاں کاتب ازل نے ہمیشگی طور پر اس کے لئے لکھ دیا ہے کہ "یہاں سے گزرنا منع ہے" انسان خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصہ ہے، مگر وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے، وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔

یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دینا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموعہ میں بے آہنگی کا جوڑ لگانا ہے۔ یہ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ ڈالنا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں ناقص چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دینا ہے۔

خدا کی قدرت اور اس کے حسنِ ذوق کا ثبوت جو عظیم تر کائنات میں ہر لحہ نظر آتا ہے وہ اس گمان کی تردید کرتا ہے کہ یہ صورت حال اسی طرح باقی رہے۔ خدا کی قدرت یقیناً اس ظلم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ خدا کا حسن ذوق ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ دن آئے جب کائنات کا یہ تضاد ختم ہو، خدا کی مرضی انسانی دنیا میں بھی اسی طرح پوری ہونے لگے جس طرح وہ بقیہ دنیا میں پوری ہو رہی ہے۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا —— ۶۵۰۰ ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ تاہم بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرا لیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔ اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔ جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منہ میں ڈالا اور نگل لیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کر لیا گیا (ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۸۱ء)

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہو سکا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔ یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دباتا ہے، وہ کسی کو وہ کلمۂ اعتراف دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو از روئے واقعہ اسے دینا چاہئے۔ یہ سب کر کے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپا لیتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ موت ہر آدمی کے لئے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لئے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

دو قسم کی روحیں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہو گیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پر مسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُر عذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجک اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیر خواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُر بہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے، مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں، مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہوگا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دو روپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لئے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لئے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تاکہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منہ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان و شوکت دکھانے کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن و انصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرلے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دھوکے بازی

برطانیہ کا ایک آرٹسٹ ہے جس کا نام اسٹیفن پریسٹ لی (Stephen Priestley) ہے۔ چیسٹر (انگلینڈ) میں ایک نیلام میں اس کی چار تصویریں رکھی گئیں۔ اس کی تصویروں کی قیمت صرف ایک پونڈ لگی۔ چنانچہ اسٹیفن پریسٹ لی (پیدائش ۱۹۵۴) کو ایک پونڈ کا چک دے دیا گیا۔

برطانوی آرٹسٹ ایک پونڈ کا چک پاکر بہت خفا ہوا۔ اس کے نزدیک ـــ اس کی ان چار تصویروں کی قیمت اس سے بہت زیادہ تھی جتنی قیمت خریدار کی طرف سے اس کو ملی۔ اس نے اپنے چک پر ایک پونڈ کی رقم کو ۱۰۰۱ پونڈ بنا دیا۔ وقتی طور پر اس نے بنک سے ۱۰۰۱ پونڈ کی رقم حاصل کرلی۔ مگر بہت جلد بنک والوں کو معلوم ہوگیا کہ اس نے بنک کے سامنے جو چک پیش کیا اس کی رقم جعلی تھی۔ اسٹیفن پریسٹ لی کو پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ جیل میں دھوکے بازی کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے (ہندستان ٹائمس ۴ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس واقعہ کا تعلق دنیا کے معاملہ سے ہے۔ مگر اسی میں آخرت کے معاملہ کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایک پونڈ کا "عمل" ہے مگر وہ اس کو ایک ہزار ایک پونڈ دکھا کر کیش کرانا چاہتے ہیں ـــــ کوئی دین کا ایک جزئی کام کر رہا ہے اور اسی کو وہ کلی کام بتاتا ہے، کوئی ذاتی شہرت کے لئے سرگرم ہے اور اس کو خدمت دین کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی قومی عصبیت کے تحت متحرک ہے اور اس کو اسلامی تحریک قرار دینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ کوئی دولت و عزت کی خاطر کسی کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو اسلامی اخوت کے پُرفخر لفظ سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بحثوں اور مناظروں میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ احیاء اسلام کا مجاہد ہے۔ کوئی معمولی اصلاح کا کام کر رہا ہے اور اس کو دعوت و تبلیغ کا شاندار نام دئے ہوئے ہے۔

ان میں سے ہر شخص موجودہ دنیا میں بھر پور طور پر اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنے معمولی عمل کو بہت بڑا عمل ثابت کرکے خوش ہے۔ مگر موت ان ساری خوش فہمیوں کو باطل کر دے گی۔ موت کے بعد آنے والی عدالت میں ایسے تمام لوگ دھوکے بازی کے مجرم قرار پائیں گے، خواہ آج کی دنیا میں وہ اپنے ایک پونڈ کے چک سے ایک ہزار ایک پونڈ کی رقم کیش کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

موت کو یاد کرو

کچھوا پانچ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ درخت ایک ہزار سال تک زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑ اور دریا کروروں سال تک اپنی شان کو باقی رکھتے ہیں۔ مگر انسان کی عمر پچاس سال یا سو سال سے زیادہ نہیں۔ انسان جو بظاہر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے وہ سب سے کم زندگی پاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مختصر زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی کی زندگی غم اور دکھ سے اتنا زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خوشی کے لمحات غفلت کی چند جھلکیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، امیدوں کی مسلسل پامالی کا نام زندگی ہے اور بالآخر اس قسم کے دردناک ایام گزارتے ہوئے ایک دن موت کے آگے شکست کھا جانا۔

ایک غریب کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس بڑا امکان نہیں۔ اس کے پاس ضروریات زندگی کے لئے کافی پیسہ نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسائل پیدا کرتا ہے جو غریب کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک مشہور آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو اندر سے اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ غرض اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی شخص ناموافق حالات سے بچ جائے اور اس خوش قسمتی کو حاصل کرلے جس کو سکھ اور چین کہتے ہیں تب بھی کتنے دن تک۔ اگر کوئی شخص اتفاقی اسباب کے تحت خوشیوں کا خزانہ اپنے گرد جمع کرلے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پالیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے آدمی پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہوجاتی ہے جس طرح ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ابدالآباد تک ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ ۲۰ سال پہلے وہ معمولی میکنک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاء اللہ اپنے کاروبار میں کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کر لی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لئے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کر لیا ہے۔ اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔ کم از کم "سو سال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کر کے مطمئن ہے۔ کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کر لیا ہے۔ کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعۂ معاش اور اپنے بنک بیلنس پر ناز ہے۔ کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی داداگیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کر لی ہے، اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔ بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لئے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل عاجز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لئے ہوئے تھے۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہو گا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی "تمھارا شناختی کارڈ"۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہو رہی تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہو رہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا "شناختی کارڈ" لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ پُرکیف منظر یہ ہو گا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لئے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہو گا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لئے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہو گی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لئے ہو گا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے کو خدا کی نظرِ عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لئے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہو جائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لئے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انھیں اسی دنیا میں کرائی جا چکی ہوگی (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم، محمد) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی توفیق انھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی (واتوا بہ متشابہا، بقرہ) حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جو آدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جنتی انسان اپنی جنت کو اسی دنیا میں پالیتا ہے۔ گویا کہ جنت کا ایک مثنیٰ اسی دنیا میں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنیٰ کو پالیا ہو۔ جنت کا یہ دنیوی مثنیٰ گویا نقد انعام ہے جو اصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفو خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔ جو ایک امر حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جنت کا۔

پلاسٹک کے پھل اور پھول

آجکل پلاسٹک کے پھول اور پھل بنتے ہیں۔ دیکھنے میں بالکل پھول اور پھل کی طرح معلوم ہونگے لیکن سونگھئے تو اس میں پھول کی خوشبو نہیں اور منھ میں ڈالئے تو اس میں پھل کا مزہ نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں دین داری کی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے۔ بظاہر اس میں دھوم کی حد تک دین دکھائی دے گا۔ لیکن قریب سے تجربہ کیجئے تو وہی چیز موجود نہ ہوگی جو دین کا اصل خلاصہ ہے: اللہ کا ڈر اور انسان کا درد ——— پلاسٹک کے دور میں شاید دین داری بھی پلاسٹک کی دین داری بن کر رہ گئی ہے۔

لوگ دین دار ہیں مگر کوئی شخص اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی شخص اللہ کی خاطر اپنی اکڑ ختم کرنا نہیں جانتا۔ ذاتی فائدہ کی خاطر بے شمار لوگ اپنے اختلاف اور شکایت کو بھول کر دوسروں سے جڑے ہوئے ہیں مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کے لئے اپنے اختلاف وشکایات کو بھول کر دوسرے سے جُڑ جائے۔

دین اصلاً اس کا نام ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پا جائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ حقیقت اتنی سنگین ہے کہ اگر وہ فی الواقع کسی کے دل ودماغ میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں انتہائی حساس ہو جاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں اور ان تمام چیزوں کا انتہائی مشتاق ہو جاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی ہستی کو خدا کی عظیم تر ہستی میں کھو دیتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے بدخواہی کرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں محض ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا اپنے تمام فرشتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔ گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خودرو گھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک نکما پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ اصلی فصل کو بھرپور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خودرو پودوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کردیں۔ کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔ اس لئے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نلائی (Weeding) کا عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایک خودرو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کردے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ نلائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اس کا شرعی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "نکمی گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔ اس نکمی گھاس کو جاننا اور اس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کئے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خودرو گھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھاجانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "نکمی گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہوجائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہوگئی، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہوگئی۔

دونوں ایک سطح پر

۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی "صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ"۔ ایک نوجوان نے خودکار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کیے۔ ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا۔ مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی۔

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے۔ فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۸۰ کے الکشن میں امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے۔ گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۱) دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (John Hinckley) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (Jodie Foster) سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا

Now you'll know who I am (H.T. 2-4-1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں۔ اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کر لیا۔ صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کر لی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے۔ دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ ایک شخص نام و نمود کے لئے دین کا علم بردار بنے، دوسرا شخص نام و نمود کے لئے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔

صرف "کرنا" کافی نہیں

بالٹی کے پیندے میں سوراخ ہو اور اوپر سے آپ اس میں پانی ڈالیں تو سارا پانی بہہ کر نکلتا رہے گا اور بالٹی کے اپنے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ آدمی کا وہی عمل حقیقۃً عمل ہے جو خود اس کو کچھ دے رہا ہو۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہ عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہل چل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔ یہی یافت کسی عمل کی کامیابی کا اصل معیار ہے۔ وہی عمل عمل ہے جو آدمی کو اس قسم کے تحفے دے رہا ہو۔ جس عمل سے آدمی کو یہ چیزیں نہ ملیں وہ ایسا ہی ہے جیسے سوراخ دار بالٹی میں پانی گرانا۔

دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی "مصروفیات" بہت بڑھی ہوئی ہوں، اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو، آپ خود کچھ نہ ہو رہے ہوں تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں (Idle Business) ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں — ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔ اسی طرح جو عمل آدمی کی اپنی غذا نہ بن رہا ہو وہ عمل نہیں صرف بے عملی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی چیز۔

پتھر کے اوپر آپ پانی ڈالیں تو وہ بظاہر پانی سے بھیگ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف پانی پانی نظر آئے گا۔ مگر پتھر پانی کے مزہ اور تراوٹ کو نہیں جانتا، اس نے پانی کی اِس دوسری حیثیت کا تجربہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایک زندہ آدمی جب پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کی رگیں تر ہو جاتی ہیں، وہ پانی کی حقیقت کا ایک "اندرونی تجربہ" کرتا ہے۔ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور ہونا کیا۔ کرنا یہ ہے کہ آدمی کچھ مقررہ اعمال کو بس رسمی طور پر دہرا لے۔ آدمی کی زبان کچھ الفاظ بولے مگر وہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بن رہے ہوں۔ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کچھ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کی روح کو نہ چھوئے۔ اس کی حرکات و سکنات اس کے دل و دماغ میں ارتعاش نہ پیدا کریں۔ اس کے برعکس ہونا یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی اندرونی ہستی کو بار بار کیفی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کا جسمانی عمل اس کے غیر جسمانی وجود میں ہل چل پیدا کر رہا ہو۔ وہی کرنا کرنا ہے جس کے درمیان آدمی خود بھی کچھ ہو رہا ہو۔ جو کرنا ہونا نہ بنے، حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ گویا ایک ایسا پتھر ہے جو بظاہر پانی سے بھیگ رہا ہے مگر پانی کا مزہ نہیں پاتا ہے۔

مقبول بندے

جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصہ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے جس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے جس کو آٹو گریفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا اور بالآخر کھال کا مذکورہ ٹکڑا الگ ہو کر گر جائے گا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے اپنی پتھالوجی کی کتاب (۱۷۷) میں لکھا ہے کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

یہ چھوٹے سلف (انسان) کی خودداری کی ایک مثال ہے۔ اسی پر بڑے سلف (خدا) کی غیرت اور خودداری کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند اور تمام یکتا پسندوں سے زیادہ یکتا پسند ہے۔ خدا کسی حال میں بھی کسی قسم کی دوئی کو گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ہر دوسرے قصور کو معاف کر دے گا مگر شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے مقبول بندے ٹھہریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سلف کے خول کو توڑ کر خدا کے سلف میں گم ہونے پر راضی ہو گئے۔ جو اپنی یا کسی دوسرے کی یکتائی کو بھلا کر خدا کی یکتائی کے آگے جھک گئے۔ جنھوں نے ہر قسم کے شرک کو چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کر لیا۔ انسان کے لئے اگرچہ یہ مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا اقرار کرے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کو مانتا ہوا نظر آئے تو وہ یا تو خوف کی بنیاد پر ہو گا یا مصلحت کی بنیاد پر۔ تاہم یہی وہ عطیہ جو کوئی انسان کبھی کسی کو نہیں دیتا اسی کا مطالبہ انسان کے خالق نے انسان سے کیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ مسلم وہی ہے جو اپنی خودی کا اثاثہ اپنے خالق کو دینے پر راضی ہو جائے۔ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی سپردگی میں دے دے۔ جو ہر اعتبار سے خدا کا تابع فرمان بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اسی کو خدا نے اپنی جنت کی قیمت بنا دیا ہے۔ جنت کی انوکھی نعمت اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گی جو اس انوکھے عطیہ کی صورت میں اس کی قیمت پیش کر دے۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمھارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کر سکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کر دو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا (فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ، الشوریٰ ۴۰)

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پاکر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جا سکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائگی سے انکار کر دیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لئے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہو سکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کناڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کناڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کناڈا میں حکومت اسرائیل کے سفیر مسٹر ہرزگ تھے۔ مسٹر ہرزگ نے برطانی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔ کسی شخص کے لئے سو فی صد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔ قاتل کہلانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔ میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی جھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے یہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔ یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

خدا کی یاد

اخبار ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (۱۵ مئی ۱۹۸۲) کے ذریعہ ہندستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے:

When a catastrophe strikes, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندستانیوں کے لئے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لئے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہو تو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگر اس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔ وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔ وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہئے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔ اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور با اختیار مخلوق ہے۔ اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔ انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔ راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے، جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہو سکتی ہے۔

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو پر اعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شاندار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین و آفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی گولی پروف لیموشین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کئے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکہ کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips

مسٹر ریگن جیسے سن ہو گئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱) یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہو گی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموشین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا ——— میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔ جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آ گیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بد اعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آ گیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہو گی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہو گا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہو گا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

جانور سے بدتر

شیخ سعدی نے کہا تھا "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور خدا کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو خدا سے نہیں ڈرتا"۔ اسی بات کو شیکسپیئر نے ایک اور انداز سے اس طرح کہا ہے ——— "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے میں بزدل کی طرح ڈرتا ہوں"۔

اس دنیا میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔ آگ کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تبھی وہ آپ کو جلائے گی۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کو اس سے دور رکھیں تو وہ ایسا نہیں کرے گی کہ وہ کود کر آپ کے ہاتھ پر آگرے۔ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے حتیٰ کہ موذی جانوروں کے بارے میں بھی ہم کو پیشگی طور پر معلوم ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ ان کا حملہ ہمیشہ دفاعی ہوتا ہے نہ کہ جارحانہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدہ کے تحت کام کر رہی ہے اور اس قاعدہ کی رعایت کر کے آپ اس کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ مگر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے عمل کا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے اور جس وقت جو چاہے کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو یک طرفہ طور پر دوسرے کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو کسی واقعی سبب کے بغیر دوسرے کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان کے حرص اور انتقام کی کوئی حد نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں اور محض ذاتی محنت کی بنیاد پر ترقی کریں تب بھی آپ محفوظ نہیں۔ کیونکہ دوسروں کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ آپ کو گرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انسان لامحدود طور پر اپنی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے اور بے حساب حد تک دوسرے کو برباد کر کے اس کی بربادی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی بدترین موذی جانور بھی اس کو نہیں جانتا کہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنائے۔ وہ کسی کو نیچا دکھا کر اپنے غرور کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرے۔ کسی کو خواہ مخواہ مصیبتوں میں پھنسا کر اس کی پریشانی کا تماشا دیکھے۔ یہ صرف انسان ہے جو ایسا کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اپنے آپ کو اسفل سافلین کی پستی میں گرا لیتا ہے۔

امتحان کا مقام

کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔ مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا آیا۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہو تو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہوگا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کئے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھا رہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمۂ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے فضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم و فساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب علم کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذی ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لئے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جا رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے اٹل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا۔ مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

الفاظ کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یک جا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹیپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل"، یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز اوما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین وملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین وملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد وغم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پالیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

دنیا کی خاطر عمل کرنے والے

لوگ خوش اخلاق ہیں۔ وہ ہدیے دیتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کام آنے کے لئے دوڑتے ہیں۔ وہ دوسرے کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بناتے ہیں۔ وہ غمی کے موقع پر اظہار درد کے لئے پہنچتے ہیں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ وہ اختلاف کے باوجود اختلاف کو بھول جاتے ہیں اور شکایت کے باوجود شکایت کو پی جاتے ہیں۔

لوگ خوش ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔

مگر لوگوں کی یہ خوش معاملگی کس کے ساتھ ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ جن سے انھیں امید ہے کہ وہ وقت پر ان کے کام آسکتے ہیں۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ جن کے زور قوت کا رعب ان کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ جن سے کٹ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے کٹ جائیں گے، جن سے جڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے جڑے رہیں گے۔

لوگوں کی یہ خوش اخلاقی تمام تر مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت معلوم ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لئے مذکورہ محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر اچانک وہی آدمی بالکل بد اخلاق بن جاتا ہے جو اس سے پہلے نہایت خوش اخلاق دکھائی دے رہا تھا۔

اب اس کو یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اب وہ اپنی دعوتوں میں اس کو بلانا بھول جاتا ہے۔ اب وہ اس کی مشکلوں میں کام آنے کے لئے نہیں دوڑتا۔ اب وہ معمولی شکایت پر بگڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے جذبات کی رعایت کرے۔ دنیوی فائدہ کے لئے اخلاق دکھانے والا آدمی اس وقت بے اخلاق ہو جاتا ہے جب کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

لوگوں کو جاننا چاہئے کہ اس قسم کی خوش اخلاقی اور انسانیت کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ وہ کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے والی نہیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں آدمی کے اندر پائی جارہی ہو۔ خدا کے ہاں جو کچھ بدلہ ہے صرف اس عمل کا ہے جو خالص خدا کی رضا اور آخرت کی نجات کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل دنیا میں اپنا معاملہ درست رکھنے کے لئے کیا جائے اس کا خدا کے یہاں کوئی بدلہ نہیں۔ ایسے عمل کا بشتارہ لے کر خدا کے یہاں پہنچنے والوں سے خدا کہہ دے گا —— تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی دنیا کے لئے کیا۔ تم دنیا میں اس کا بدلہ پاچکے۔ اب آخرت میں تمہارے لئے اس کے بدلے میں کچھ نہیں۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور پر ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اور ماتحت کارکنوں کو تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے وہ تو ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس اداروں اور ملی کاموں میں جو رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہ میں اصل بات کچھ اور ہے اور یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے۔ غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (سوشل اسٹیٹس) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس نہ اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شاندار معاوضہ ملے گا —— جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پرزور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقۃً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہو جاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کر لیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لئے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

خدا کو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت اتنی نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہوگی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس نے خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو قرآن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس ہونے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے، جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل و دماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جاچکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی کھیتی ہے۔ ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لئے کچھ نہ ہو گا جو اس کا سہارا بنے۔

یہ انسان!

حضرت مسیح کے وعظوں میں سے ایک وعظ میں داعی اور مدعو کی تمثیل ہے۔ یہاں ہم اس تمثیل کا عربی اور اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

وبمن اُشبّه هٰذا الجيل۔ يُشبِه اولاداً جالسين فى الاسواق ينادون الى اصحابهم ويقولون: زمّرنا لكم فما رقصتم وندبنا لكم فما بكيتم (متی ۱۱: ۱۶)	پس اس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں۔ ہم نے تمھارے لئے بانسری بجائی اور تم نہ ناچے۔ ہم نے ماتم کیا اور تم نہیں روئے

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن و کمال کی تجلیاں ہوتی ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے۔ دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رلا دیں۔ داعی خدا کے جمال و جلال کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ خدا کو نہیں پاتا۔ اس میں نہ حمد خداوندی کی کیفیات جاگتیں اور نہ خوف خدا سے اس کی آنکھیں تر ہوتیں۔ وہ نازک ترین پیغامات کو بھی پتھر کی طرح سنتا ہے نہ کہ اس انسان کی طرح جس کو خدا نے وہ عقل دی ہے جو باتوں کی گہرائی کو پالے اور وہ دل دیا ہے جو درد سے تڑپ اٹھے۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہوتا ہے جس کی شدت آتش فشاں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا شاید یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو متاثر نہیں کرتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے "نذیر عریاں" بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں پھر بھی وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے پھر بھی وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔ انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی کوئی نہیں دیتا۔

Regd. D(DN) No. 532 Issue No. 77

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851